ڈاکٹر فردوس انور قاضی

میر تقی میرؔ کی شاعری اور انسان

Abstract: - *The work of Mir Taqi Mir, portrays a true picture of human sentiments and emotions. In this article the same quality of Mir has been discussed ,so that a live picture reader can see in his work and his emotions and sensitivity can be comparatively understood. Over all this research paper describes that Mirs poetry obviously shows that humanity which have the power to eradicate challenges and to compensate them. Therefore, for the sake of humanity survival we have to return back towards the same phase of human life because avoiding it will altered human society into a robot society where, no relation can survive among human beings that can make hindrance to provoke and enhance love and peace.*

میر تقی میرؔ کی شاعری کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے عہد کو سمجھا جائے جس میں سلطنت مغلیہ کے زوال کی تقریباً پوری تاریخ سمٹی ہوئی ہے 1707ء میں اورنگزیب کی وفات کے بعد بہادر شاہ اول جو بھائیوں کو قتل کر کے بادشاہ بنا تھا۔ 1712ء میں اس کی وفات کے بعد افراتفری، خانہ جنگی اور بدامنی کے بعد جہاں دارا کی تخت نشینی، اس کی عیاشیوں کے سبب نااہلوں کا عروج، ایک سال بعد فرخ سیر کے ہاتھوں اس کا قتل، پھر فرخ سیر کی بادشاہت کا زمانہ جو درباری سازشوں کیلئے مشہور ہے۔ 1719ء میں اندھا کر کے اس کا قتل کیا جانا، محمد شاہ کا سلطنت میں آنا..... اس کی رنگ رلیوں کی داستانیں ایسے واقعات ہیں جن کے نتائج آخر کار نادر شاہ کے حملے کی شکل میں نمودار ہوئے۔

نادر شاہ کے حملے سے پیدا ہونے والی انسانی زندگی اور بے حرمتی کی داستان تاریخ کا وہ بھیانک باب ہے جس کے آئینے میں انسان کا چہرہ درندوں کے مشابہہ نظر آنے لگتا ہے۔ سڑکوں پر لاشوں کے انبار، بے چراغ گھر، ویران سڑکیں اور اجڑی بستیاں انسان کی خود غرضی، حرص و ہوس اور نفرت کی وہ مجسم تصاویر ہیں جنہیں دیکھ کر انسان کے اشرف المخلوق ہونے کا دعویٰ مضحکہ خیز معلوم ہونے لگتا ہے۔

نادر شاہ کے حملے کے وقت میر تقی میر کی عمر 17 برس تھی۔ ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور منہ

بولے چچا بھی دار فانی سے کوچ کر گئے تھے اور زندگی کے لق ودق صحرا میں میر تقی میرؔ تن تنہا کھڑے زندگی کے اس بھیانک کھیل کو دیکھ رہے تھے۔ 1748ء میں محمد شاہ کے مرنے کے بعد احمد شاہ کی تخت نشینی.....صفدر جنگ اور نواب بہادر کی باہمی جنگ اور دشمنی کے اثرات، مرہٹوں، جاٹوں اور روہیلوں کی سرکشی عماد الملک کا فتنہ وفساد جس کے سبب زندگی ایک خوفناک ڈرامہ بن چکی تھی۔ امراء اور روساء کا باہمی اختلاف جس نے مغلیہ سلطنت کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ شہزادوں، شہزادیوں کی تذلیل، لوٹ مار کے علاوہ احمد شاہ ابدالی کے نو حملے جن کے سبب درندگی کا کوئی کھیل ایسا نہیں بچا تھا جو نہ کھیلا گیا ہو۔

تاریخ کے ان واقعات کی طرف ہلکے ہلکے اشارے کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان خارجی حالات اور ماحول کو پیش کیا جائے جس نے میرؔ کے قلب ونظر میں دکھ کو جھیلنے اور برداشت کا ایک ایسا سلسلہ دراز کیا جو ان کی شاعری میں سچے اور بے کنار عشق کو جنم دینے کا باعث بنا۔ عشق کا یہ تصور جو میرؔ کی شاعری کا وصف خاص ہے انسانی زندگی کے ان خفیہ گوشوں کو منکشف کرنے کی قدرت رکھتا ہے جس کا تجزیہ سائنس کی کرشماتی فتوحات کے باوجود آج تک ممکن نہیں ہوسکا۔

دلی کے اجڑنے اور بار بار اجڑنے کے بعد انسانی زندگی پر کیا گزری میرؔ اس کے محض تماشائی نہ تھے بلکہ غم کی اس بھٹی میں پگھل کر ان کے دل میں وہ گداز پیدا ہوا جو عشق کی اصل معنویت کے بھید کھول سکتا ہے۔ اس معنویت کی وضاحت آسان نہیں لیکن گوشوں کو منکشف کرنے کی قدرت رکھتا ہے جس کا تجزیہ سائنس کی کرشماتی فتوحات کے باوجود آج تک ممکن نہیں ہوسکا۔

دلی کے اجڑنے اور بار بار اجڑنے کے بعد انسانی زندگی پر کیا گذری میرؔ اس کے محض تماشائی نہ تھے بلکہ غم کی اس بھٹی میں پگھل کر ان کے دل میں وہ گداز پیدا ہوا جو عشق کی اصل معنویت کے بھید کھول سکتا ہے۔ اس معنویت کی وضاحت آسان نہیں۔ لیکن غالب کے اس شعر سے شاید معنویت کا کوئی رنگ کوئی آہنگ ادراک تک رسائی حاصل کر سکے۔

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پر گہر ہونے تک

قطرے کا گوہر ہونا شاید عمومی زندگی میں شہرت عام بقائے دوام کی منزلوں کا پتہ دیتا ہو.....لیکن داخلی زندگی میں قطرے کا گہر ہونا۔ ذات کی نفی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پھر نہ دیکھا کچھ بجز اک شعلہ پر پیچ و تاب
شمع تک ہم نے بھی دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

یا

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا

کی منزل.....اور اس کی آشنائی کا وہ رنگ ہے جہاں تک رسائی میرؔ کے علاوہ شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ اٹھارویں صدی اور اس عہد کی انسانی زندگی کا عکس سوداؔ، مصحفیؔ، شاہ ظہور الدین حاتمؔ، راسخؔ عظیم آبادی کے اشعار میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک پوری تہذیب کی موت کے وقت انسانی زندگی پر کیا گزرتی ہے وہ کون سے حالات ہیں جو کسی سچے انسان کو روح کی گہرائیوں تک زخمی کر سکتے ہیں اس عہد کے بیشتر شعراء کے یہاں وہ تصاویر دیکھی جاسکتی ہیں لیکن خون جگر کا لفظوں میں ڈھلنا کیا ہوتا ہے اس کا احساس میرؔ کی شاعری کو پڑھنے کے بعد ہی ممکن ہوا۔

ان کی شاعری میں دکھ کی معنویت کے ساتھ ساتھ جذبوں کی تپش بھی پڑھنے والوں کے دلوں تک رسائی حاصل کرتی ہے اس کی وجہ میر تقی میرؔ کی فطری حساسیت، ان کے حالات زندگی، بچپن میں ہی دکھوں کا سامنا اور زندگی کی صحرا صفت اصلیت سے آگاہی ہے۔

میرؔ کی شاعری میں سچائی کا حسن اس بات کی دلیل ہے کہ زندگی کے دکھوں اور مسائل نے ان کی شخصی زندگی میں منفی رویوں کو جنم دینے کی بجائے انسان سے محبت کے اس اجتماعی رویے کو جنم دیا جسے شاعری یا ادب کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے اور جس اساس سے موجودہ عہد کے بیشتر سوکال پڑھے لکھے افراد ہی نہیں بلکہ

بعض ادیب اور شعراء تک بے خبر سے لگتے ہیں۔

میرؔ کی شاعری ان کے عہد کے انتشار، زبوں حالی، اجتماعی انحطاط اور سیاسی زوال کے باوجود انسان کے انفرادی ایثار اور سچی محبتوں کے اس اظہار کی کہانی ہے جو انفرادی رویے میں بھی خارجی حقائق اور اجتماعی حقیقت کو منعکس کرنے پر قادر ہے جو موجودہ عہد کی ترقی اور حیرت انگیز ایجادات اور تہذیب کے دعوؤں کے باوجود اب تقریباً ناپید ہوتی جارہی ہے میرؔ کے کلام میں غم روزگار اور غم جاناں کے اظہار میں سیکڑوں دلوں کے غم، محرومیاں اور تشنہ جذبوں کی دھڑکنیں مجسم ہیں ان کی شاعری میں مرتے ہوئے اس عہد کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں جو اُس تہذیب کا نوحہ بن چکا ہے۔

؎ دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

؎ اب خرابہ ہوا جہاں آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا (میر)

؎ شمع آخر شب ہوں سن گزشت میری
پھر صبح ہونے تک ، تو قصہ ہی مختصر ہے

میرؔ کو دلی سے جو محبت تھی اس کے آئینے میں دلی کے اجڑنے، لٹنے اور ویران ہونے کے دکھ نے ان کی شاعری کو اس عہد کی ایک ایسی تاریخی دستاویز بنا دیا ہے جس میں زندگی سمٹ کر اپنے تمام دکھوں اور جذبوں کے ساتھ رواں دواں نظر آتی ہے تاریخ اور ادب کی ہم آہنگی سے جنم لیتی یہ مثال کسی ادیب اور شاعر کے یہاں اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک وہ پوری صداقتوں کے ساتھ اپنے عہد کے دکھ میں شریک نہ ہو۔ یا وہ اپنے عہد کی آگاہی نہ رکھتا ہو۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انہی کی آنکھ میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

میرؔ کے یہاں غم کا جو تصور ہے وہ صدیوں پر محیط ایک تہذیب کے اجڑنے کا ایسا المیہ گیت ہے جس میں جذبوں کی صداقت، ان کی سرمستی اور غم سمٹ کر ایک سچی آواز میں ڈھلا ہے۔

دلی کی تباہی، ویرانی اور تکلیف دہ حالات کے باوجود میرؔ نے اس کو چھوڑنے کا ارادہ نہیں کیا۔ وہ اسے چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن پھر وہ وقت بھی آیا جب انہیں دلی چھوڑنا پڑی..... ادبی تاریخی حوالوں سے دلی کا اجڑنا لکھنؤ کی آبادی کا سبب بنا تھا۔

ایک طرف دلی کی سسکتی شامیں اور انسانی زندگی کے آنسو تھے دوسری طرف لکھنؤ کی عیش و طرب میں ڈوبی شاعری..... ایک طرف دلی سے نکلی ہوئی درد انگیز صدائیں اور دوسری طرف عیش و عشرت میں ڈوبے نغمے۔ آصف الدولہ کے بلانے پر میرؔ لکھنؤ آ گئے تھے لیکن زندگی سے بے خبری کے ساز سے ابھرتے نغموں نے انہیں خوش نہیں رہنے دیا۔ عیش و عشرت سے جنم لینے والا سوقیانہ رنگ فحش مذاق اور شاعری میں لفظی صنعت گری کا کھیل جس کو معنویت اور جذبوں پر سبقت حاصل تھی میرؔ کے مزاج کا حصہ نہیں بن سکا انھوں نے بڑے دکھ سے اس کا اظہار کیا ہے۔

؎ خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنو سے تھا
وہیں میں کاش مرجاتا ، سراسیمہ نہ آتا یاں

؎ مربوط کیسے کیسے کہے ریختے ولے
سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

دلی اجڑنے کے بعد، لکھنو کی رنگ مستیاں، زندگی کو ایک نئی ڈگر، نیا رنگ اور نیا ساز دینے کے مترادف تھیں جس میں غموں سے نڈھال اور مفلسی کے مارے ہوئے شعراء کا ڈوب جانا شاید غیر فطری بھی نہ ہوتا لیکن میر تقی میرؔ کے ثبات عشق، تہذیب نفس اور یقین کامل میں کہیں کوئی لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ ان کی شاعری میں محبت کی وہی مٹھاس اور نشہ میں ڈوبی وہی لے زندہ رہی جو انفرادی سود و زیاں سے بلند ہوئے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔

آگے کسی کے کیا کریں دست طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

ہیں مُشت خاک لیکن جو کچھ ہیں میرؔ ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

سب میرؔ کو دیتے ہیں جگہ آنکھوں میں اپنے
اس خاک راہ عشق کا اعزاز تو دیکھو

زیر فلک بھلا تو روئے ہے آپ کو میرؔ
کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہوگیا

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

میر تقی میرؔ کی شاعری میں وارداتِ عشق اور آبلہ پائی کے سچے تجربات ہیں جنھوں نے ذاتی خواہشوں کے اسیر مصنوعی عشق اور اس سے جنم لینے والے مصنوعی غم سے ان کی شاعری کو محفوظ رکھا ہے۔ سچی عشقیہ واردات نے قلب ونظر کو جس بے قراری سے آشنا کیا اس کے ساتھ چلتے چلتے یہ جاننا کہ صبر وسکون کی منزل تک رسائی کتنی کٹھن ہے اس کا اندازہ وہ شعراء نہیں کر سکتے جو ابتدائے عشق میں ہی طلب و رسد کے گوشوارے بنا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور کے بیشتر شعراء کے یہاں عشق کی بجائے عشق بازی کا رنگ جھلکنے لگتا ہے جس کے سبب شاعری میں سچائی کا وہ حسن ناپید ہوتا جارہا ہے جو عہد قدیم کے شعراء، متوسطین اور موجودہ دور میں فیضؔ تک پہنچا تھا۔

مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

''تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی'' کے رویے نے حسن وعشق کے وہ نقوش ہی دھندلے کر دیئے جو انسان کو کندن بنانے پر قادر تھے۔ اور جو ادب اور شاعری کو ایک ایسا آئینہ بنا سکتے تھے جس میں ہر عہد اپنی ''پوری آب وتاب'' کے ساتھ زندہ نظر آسکے یہاں آب وتاب کے لفظ سے دھوکہ کھانے کی ضرورت نہیں۔ یہ آب وتاب محض حسن کی جلوہ گری نہیں ہے بلکہ حقیقت پر مبنی..... وہ آئینہ ہے جو ''اجتماعی شعور'' سے تشکیل پاتا ہے میرؔ کی شاعری اجتماعی شعور کی کہانی ہے۔ وہ ذاتی تجربات کی بھٹی میں پگھل کر خارجی زندگی کا ہر عکس اپنے اندر سموئے ہوئے نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں عشقیہ رویہ ایک شخص کی ذاتی زندگی سے متعارف نہیں کراتا بلکہ پورے عہد کا تعارف بن کر سامنے آیا ہے میرؔ کی شاعری میں ہجر یہ لے محض ایک شخص سے دوری کی نوحہ بن کر نہیں ابھری بلکہ اس میں پوری تہذیب کے مٹنے اور بچھڑنے کا دکھ مجسم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ہمہ گیر عشقیہ قوت کارفرما ہے جو ذاتی حدود سے نکل کر اپنے پورے عہد اور پوری انسانیت کا احاطہ کرتی ہے۔

ہر مہذب اور ترقی یافتہ معاشرے میں ادیب یا شاعر پوری قوم کا ذہن سمجھا جاتا ہے جس کی نگاہ دور بین ماضی اور حال کے تجربات سے مستقبل کی تصویر کشی کرتی ہے جو قوم کی رہنمائی کا ذریعہ بنتی ہے لیکن وہ ادیب اور شاعر جو انسانی زندگی کے ہمہ گیر مسائل اور اپنے عہد کے اجتماعی رویے سے بے خبر ذاتی تنہائی یا ذاتی مفادات کے حوالے سے گیت بُنتے ہوں وہ کسی بھی قوم کا ذہن اور دل کیسے ہو سکتے ہیں۔ جب کسی قوم کے وہ ادیب اور شاعر جو خوش قسمتی سے اپنی شناخت رکھتے ہیں کسی دور دراز علاقہ میں نئی نسل کی رہنمائی اور تہذیبی رویوں کی پرورش پر فائیو اسٹار ہوٹلز میں قیام وطعام اور بھاری معاوضوں کو ترجیح دینے لگیں تو اس قوم کو غلامی کی زنجیروں سے کوئی معجزہ بھی شاید آزاد نہیں کرا سکتا غور کیا جائے تو ذمہ داری کے لحاظ سے بادشاہوں اور ادباء و شعراء میں ایک قدر مشترک ہے وہ ہے قوم کی رہنمائی کا فریضہ۔ لیکن ایسا لگتا ہے جیسے 18 ویں صدی عیسوی میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے سائے میں پروان چڑھنے والی خودغرضی، افراتفری، خانہ جنگی، بدامنی، محلاتی سازشیں، مرہٹوں، جاٹوں اور روہیلوں کی لوٹ مار کا ہر انداز اکیسویں صدی تک آتے آتے علامتی انداز میں ادیبوں اور شاعروں کی بستی میں بھی اتر آیا ہے جس نے مغلیہ سلطنت کی طرح قومی زندگی کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ میرؔ کی شاعری نے ایک ایسے عہد میں جنم لیا تھا جو ایک طرح سے قومی، تہذیبی اور تمدنی انتشار کا شکار

تھا۔ میرؔ کی شاعری اس عہد کی جذباتی اور معاشرتی زندگی کے پس منظر میں اس انتشار کو بھی پیش کرتی ہے۔ میرؔ نے لکھنو کی اس شاعری کی طرف توجہ نہیں کی جو خارجی حسن قافیہ پیمائی اور صنعت گری کے سائے میں پروان چڑھنے کے سبب ایک فیشن کا درجہ پا چکی تھی۔ میر تقی میرؔ وقتی پسند اور ناپسند کے پیمانوں کے اسیر کبھی نہیں رہے۔ ان کی تخیلی پرواز فطرت کے نہاں راز تک رسائی رکھتی ہے۔ جس میں داخلی صداقت نے تاثیر کی وہ قوت پیدا کی جو ان کے ہم عصر یا بعد کے شعراء میں شاید ہی کسی کے حصے میں آسکی ہو۔ اس حوالے سے میرؔ نے اپنی شاعری کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع سو دیوان کیا

شاعری ایک ایسا آرٹ ہے جس میں جذبوں کی صداقت کے بغیر تاثیر کا حسن اور معنوی جادوگری اپنا کام نہیں دکھاتی۔ میرؔ کے کلام کی تاثیر اور سحر کاری اپنی ایک الگ پہچان رکھتی ہے جس میں عشق کی وادی جان سوز میں اس عہد کے انتشار، اضطراب اور بے سمتی کے درمیان حیران و پریشان زندگی ایک آدمی کے روپ میں مجسم ہے۔ ان کی شاعری میں دل کی وادی پرخار اور دلی کی ویرانی تہذیب و روایت کے قدموں کی چاپ، تاریخی عوامل اور گزرتے وقت کے ساتھ ایک عہد کے مٹنے کے نشان بھی ملتے ہیں۔ یہ شاعری کی وہ منزل ہے جو ریاضتوں کے مرحلہ وار تجریدی سفر کے بغیر ممکن نہیں۔ ان کے والد جو عشقِ حقیقی کی اس منزل پر فائز تھے جہاں خالق و مخلوق کے درمیان حائل تمام پردے ہٹ جاتے ہیں وہ ہمیشہ خالقِ حقیقی کے سامنے سربسجود رہا کرتے۔ ہوش میں آتے تو کہا کرتے ''بیٹا عشق اختیار کرو کہ عشق کے بغیر زندگی وبال ہے''۔

عشق کی سچائی کے بغیر زندگی کے وبال ہونے کا تصور آج کتنے لوگوں کے پاس ہے؟ عشق کی وہ معنویت جو اس کائنات کی تخلیق کا سبب بنی۔ اس تک رسائی کتنے ادیبوں، شعراء اور اہل علم حضرات کے حصے میں آئی؟ اور طواف کی اس قوت کو کس نے سمجھا جس کے نتیجے میں وہ کشش پیدا ہوئی جو اس کائنات کو دائم و قائم رکھے ہوئے ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو میرؔ کی شاعری کو پڑھ کر ذہن میں ابھرتے ہیں میرؔ کی شاعری میں وہی نظم

وضبط نظر آتا ہے جو کائنات کے ہر سیارے اور ستارے کی گردش میں قائم ہے۔ میرؔ کے عشق میں طواف کی وہی کشش دکھائی دیتی ہے جس نے کائنات کے اتنے بڑے نظام کو قائم رکھا ہوا ہے۔ یہی نظام جب آدمی کی اندرونی کائنات میں قائم ہوتا ہے تو بصیرت کے وہ دروازے کھلنے لگتے ہیں جن کا تصور عام آدمی نہیں کرسکتا۔ جس کے ذریعہ عشق کی بے قراری میں بھی ایک ایسا قرار جنم لیتا ہے جو آدمی کو نہ صرف منظم رکھتا ہے بلکہ خود آدمی کے لئے بھی اس کی سلامتی کا ذریعہ بن کر اسے دنیاوی کثافتوں سے محفوظ کر لیتا ہے۔ میرؔ نے اسی لئے کہا ہے کہ:

کون مقصد کو عشق بن پہنچا
آرزو عشق، مدعا ہے عشق

درد ہی خود ہے، خود دوا ہے عشق
شیخ کیا جانے، تو کہ کیا ہے عشق

تو نہ ہووے تو نظم کل اٹھ جائے
سچ ہیں شاعران، خدا ہے عشق

کوہکن کیا پہاڑ کاٹے گا
پردے میں زور آزما ہے عشق

کیا رفتگی سے میرؔ تم گفتگو کرو ہو!
کھویا گیا نہیں میں، ایسا جو کوئی پاوے

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا
ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور

عشق کی یہ وسیع و عریض معنویت ہمیں اپنے بیشتر کلاسیکی شعراء کے یہاں نظر آتی ہے لیکن میرؔ کے یہاں جتنی سادگی اور تاثیر کی قوت بن کر ابھری اس تک رسائی کسی اور کے حصے میں آئے ذرا مشکل سی بات نظر

آتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو عشق کا اضطراب ہی وہ حقیقت ہے جس کے سبب ہر ذرہ کائنات اور کائنات میں موجود تمام سیارے اور ستارے طواف کی جس کیفیت سے گزر رہے ہیں وہی طواف ان کے نظم وضبط اور بقا کا ضامن ہے۔ انسان کی ذات میں یہی نظم وضبط، وفاداری بشرط استواری کے دائمی رویوں سے تشکیل پاتا ہے۔ وقتی پسند اور وقتی ضرورت کے تحت پیدا ہونے والا عشق ان بادلوں کی طرح ہوتا ہے جو ہوا کے دوش پر اڑتے تو نظر آتے ہیں لیکن برستے نہیں۔

میرؔ کی شاعری میں وفا کا رنگ دائمی محبت کی خوشبو رکھتا ہے۔ جس کی مہک پڑھنے والوں کو بھی دائمی جذبوں کی آگاہی دیتی ہے۔

؎ کیا میرؔ ہے یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا!
نمناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا

؎ اُمڈی آتی ہیں آج یوں آنکھیں
جیسے دریا کہیں ابلتے ہیں

؎ چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم نے جانا تھا کہ اے میرؔ یہ آزار گیا

؎ دل جو نہ تھا تو رات زخود رفتگی میں میرؔ
گہہ انتظار تھا وہ گہہ اضطراب تھا

؎ قامت خمیدہ ، رنگ شکستہ ، بدن نزار
تیرا تو میر غم میں عجب حال ہوگیا

؎ گلی میں اس کے گیا، سو گیا نہ بولا پھر !
میں میرؔ ، میرؔ کر اس کو بہت پکار رہا

تجربے کی صداقت، بے خودی، بے نیازی، خودداری اور سادگی کا یہ حسن میر کی شاعری کا ایک ایسا نقش ہے جس میں بزرگوں کی سیرت کے وہ رنگ بھی چمکتے نظر آتے ہیں جن کے ذریعہ میر کی زندگی اور شاعری نے تشکیل پائی اور ساتھ ساتھ قلندری شان بھی پیدا ہوئی۔

؎ کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھوں
کہ بزمِ عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

؎ دور بیٹھا غبار میرؔ اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

؎ میں گریہ خونی کو روکے ہی رہا ورنہ
یک دم میں زمانے کا یہاں رنگ بدل جاتا

میرؔ کی شاعری ایک ایسی اداسی کی تصویر دیتی ہے جس میں ان کے انفرادی لہجہ میں بے رحم خارجی عوامل کا ردعمل بھی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ان کی فکر پریشاں میں جو وقار اور عشقیہ شان ہے وہ خارجی حقائق کی بے رحمی کے باوجود کہیں مجروح نہیں ہوئی۔ خارجی حالات کی شقاوت کے باوجود انسان کی عظمت اور اعلیٰ اقدار کا احترام ان کی شاعری میں محبت، نرمی اور حلاوت کے ان رویوں کو پیش کرتا ہے جس میں بے قراری کے باوجود بے نیازی کی شان دکھائی دیتی ہے۔

میرؔ کی شاعری میں بدلتے حالات اور رخ بدلتی تاریخ کے گہرے اثرات ہیں جن کو وہ روک نہیں سکتے تھے۔ ان کی اپنی زندگی بھی دکھوں سے مزین تھی شاید ہی کوئی وقت ایسا آیا ہو جب انہیں غموں سے فراغ نصیب ہوا ہو۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ ہر قسم کے مشکل حالات میں بھی میرؔ نے بڑے سلیقے سے زندگی کے ساتھ نباہ کیا۔ مشکلات نے ایسے رخ بھی دکھائے جہاں مضبوط سے مضبوط آدمی کا سانس لینا بھی دوبھر ہو جاتا لیکن میرؔ کے لہجہ میں کوئی لغزش نہیں آئی بلکہ لہجہ محتاط اور مضبوط ہوتا گیا۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہہ شیشہ گری کا

دھیما، پرسوز اور محتاط رویہ جس میں کہیں غیر شائستگی یا گلہ کا انداز پیدا نہیں ہوتا۔ انھوں نے زندگی کو بغاوت کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا بلکہ ان کے رویے میں تسلیم و رضا کے رنگ نے وہ حسن پیدا کیا جس کے آئینے میں انسان بہت پیارا لگنے لگتا ہے۔ آگاہی کا حسن ان کی شاعری میں ایک توانا آواز میں ڈھلا ہے جس میں ہمت اور حوصلے اور تسلیم و رضا نے طوفانوں کو سمیٹ کر نہ صرف گوارہ بنایا بلکہ صبح کی تازہ ہوا میں بدل دیا ہے۔

- عشق ہمارا آہ نہ پوچھو ، کیا کیا رنگ بدلتا ہے
  خون ہوا ، دل داغ ہوا ، پھر درد ہوا، پھر غم ہے اب

- عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
  دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

- رنگِ شکستہ اپنا بے لطف بھی نہیں ہے !
  یہاں کی بھی صبح دیکھو اک آدھ رات رہ کر

- پاس ناموس عشق تھا ورنہ
  کتنے آنسو پلک تلک آتے

- خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب لیکن
  رہے ہے خوف مجھے واں کی بے نیازی کا

- شوق تھا جو یار کے کوچے میں ہمیں لایا تھا میرؔ
  پاؤں میں طاقت کہاں اتنی کہ اب گھر جائیے

- ہیں مشت خاک لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں
  مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

ان تمام اشعار کے پس منظر میں اگر اس عہد کے حالات کو دیکھا جائے جس میں عام آدمی کی زندگی کی تو حیثیت کیا جہاں شہزادے، شہزادیاں اور بادشاہوں کی رسوائی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ نادر شاہی حملے، درندگی کے کھیل اور دلی کی تباہی کے بعد میرؔ کی بے بسی جو انہیں لکھنؤ لے گئی اور پھر وہاں کا اجنبی ماحول جو کسی طور بھی ان کے تہذیبی رویوں کا ساتھ دینے سے قاصر تھا۔ اس میں میرؔ جیسے حساس، ذہین اور نازک آدمی کا خود کو سمیٹ کر رکھنا بھی کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے نہ صرف خود کو سمیٹ کر رکھا بلکہ ان کے تیور اور مضبوط لہجہ جس قسم کی شاعری میں ڈھلا ہے وہ بذات خود کسی معجزے سے کم نہیں یہ آواز اور لہجہ اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ واقعی انسان خدا کی سب سے بڑی تخلیق ہے۔

- خدا ساز تھا آذر بت تراش
  ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں

- برسوں لگی رہی ہیں مہر و مہ کی آنکھیں
  تب کوئی ہم سا صاحب ، صاحبِ نظر بنے

- آدمِ خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ
  آئینہ تھا تو مگر قابل دید نہ تھا

فانی نے کہا تھا کہ:

- منزل عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی !
  تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

مادی خواہشات کے حصول کی تمنا ہی وہ آگ ہے جو آدمی کو انسان نہیں رہنے دیتی جب تک بے

نیازی کی شان نہ ہوکوئی کام وہ قوت نہیں پاتا جوآدمی کو جاوداں زندگی کا حسن عطا کر سکے۔ میر تقی میرؔ کی شاعری سے ابھرنے والا آدمی دراصل اس آدمی سے ملواتا ہے جس نے زندگی کے تمام دکھوں کو اپنی ذات میں تحلیل کر کے اس انسان سے ملوایا ہے جس کو خالق حقیقی نے بڑی محبت اور فخر کے ساتھ تراشہ تھا اور جس پر اسے ناز ہے۔ یہی سبب ہے کہ میرؔ کی شاعری ذاتی تجربات سے گزر کر آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کی شناور بنی جس نے اس انسان کی تخلیق کروائی جس کی شان میں گستاخی گزشتہ بھی ناپسندیدہ قرار پائی تھی اور جسے خارجی حالات کی سنگینی اور غموں کی آگ میں جھلستی زندگی نے کندن بنادیا تھا۔

میرؔ کی شاعری میں جو نغمگی اور صداقت کی آنچ ہے اس کو وہ لوگ مشکل سے سمجھ سکتے ہیں جن کی عشقیہ قوتیں، مادی وسائل کی پرستش تک محدود ہوں یا وہ جسمانی حدود سے گزر کر روحانی سطح پر کسی تجربے سے نہ گزری ہوں ان کی شاعری میں عشقیہ لے ایک ایسی آگ کی مانند ہے جو انسان کی منفی صفات کو پگھلا کر مثبت انسانی رویوں میں ڈھالتی ہے اور ایک ایسے انسان سے ملواتی ہے جو معصوم، سچا، مضبوط اور محبت کی ایک مجسم شکل ہے۔

؎ سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اور گئے پر سجدہ ہر ، ہر گام کیا

؎ سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

؎ زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

؎ لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

یہ زندگی جو سیل حوادث کا مجسم اظہار ہے اس کو کامیابی سے عبور کرنے کے لئے جس قوت کی ضرورت ہے اس قوت کا نام ہی شاید عشق ہے وہ عشق جو بے نیازی کی شان پیدا کر سکے۔ جو سود و زیاں سے بلند کر کے ذات کی نفی اور اس کی وہ معنویت منکشف کر سکے جس کے بغیر آدمی عرفان کی وہ منزل نہیں پا سکتا جس میں قطرے کو سمندر بنانے کی شکتی ہو۔ میر تقی میرؔ اس منزل سے بے خبر نہیں تھے۔ ان کے یہاں ایسے اشعار جن میں زندگی کی لایعنیت کا احساس ملتا ہے ثبوت کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

؎ زندگی اپنی خواب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

؎ مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لیکر !

؎ کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا !
ع یہ منزل نہیں یا بے خبر راہ ہے

دردمندی ان کی شاعری میں ایک ایسا جذبہ ہے جس نے ان کی شخصیت میں جاری و ساری اس قوت سے تشکیل پائی ہے جس نے درویشوں کی رفاقت، والد کی قلندری اور عشق حقیقی کی سرشاری کے زیر سایہ پرورش پائی تھی۔ اگر غور کیا جائے تو یہ دردمندی اور سرشاری غالبؔ کے منفرد انداز بیان کے باوجود ان کی شاعری میں نظر نہیں آتی۔

میرؔ کی شاعری میں غم کا تصور حاوی ہے لیکن اس کے باوجود یکسانیت اور قنوطیت کا رویہ نہیں ہے ان کی شاعری کو پڑھنے والا ایک ایسی دھیمی دھیمی مدہم آنچ سے گزرتا ہے جو غیر محسوس طور پر دنیاوی گرد و غبار دھو کر نرمی حلاوت اور اندر کے انسان کو نکھار دیتی ہے۔ غالب کے یہاں کائنات گیر سوالات اور فکری سطح پر سوچ کا منفرد انداز بلاشبہ انہیں دنیا کے بڑے شعراء کی صف میں کھڑا کرتا ہے لیکن ان کا جذبہ عشق کائنات کی نئی آگاہی

اور جذبات کی اس تہذیب سے آگاہ نہیں کرتا ہے جس سے متعارف کرانے کے لئے ہی شاید انسان کی تخلیق عمل میں آئی تھی۔ یہاں تک کہ اقبالؔ کی شاعری کی اساس بھی اسلامی تعلیمات، مغربی اور مشرقی افکار و نظریات کے سہارے پر قائم ہے جبکہ میرؔ کی شاعری خالص انسانی جذبوں کی دھیمی موسیقیت پر قائم ہے جو کسی فکر اور فلاسفی کی محتاج نہیں بلکہ محسوسات کی ایسی تنظیم نو کرتی ہے جس نے غم عشق اور غم آفاق کے امتزاجی رویے سے جنم لیا ہے۔ یہ امتزاجی رنگ داخلی انسانی جذبوں کی تربیت کا ایک انوکھا تجربہ ہے جو کبھی کبھی علمی وسعتوں سے ماورا ہو کر ایک ایسے انسان سے ملواتا ہے جس نے ازل کے وقت اس بوجھ کو اٹھانے کی ہمت کی تھی جسے اٹھانے کے لئے جن، فرشتے، زمین اور آسمان سب ہی کانپ گئے تھے۔

؎ زیر شمشیر ستم میرؔ تڑپنا کیسا
سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

؎ دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا ہے

؎ کچھ کرو فکر مجھ دِوانے کی
دھوم ہے پھر بہار آنے کی

؎ صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

میرؔ کے یہاں عشق کو وہ بوجھ جو ازل سے صرف انسان کو ودیعت ہوا اسے اٹھانے کا نہ صرف حوصلہ دکھائی دیتا ہے بلکہ وہ خصوصیات بھی نظر آتی ہیں جو اس بوجھ کا امین ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ شعر ملاحظہ ہوں

؎ دل کس قدر شکستہ ہوا تھا کہ رات میرؔ
جو بات لب پہ آئی وہ فریاد ہو گئی

؎ جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

؎ مجلس آفاق میں پروانہ ساں
میرؔ بھی شام اپنی سحر کر گیا

؎ ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

؎ نہ شکوہ شکایت، نہ حرف و حکایت
کہو میرؔ جی آج کیوں ہو خفا سے

؎ یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

ان اشعار کے اندر عشقیہ قوتوں کی شدت اور کارفرمائی کے ساتھ لہجے کی شائستگی اور سمندر کی گہرائیوں جیسے سکون اور ٹھہراؤ کا کمال بھی ہے اور خارجی صناعی کی حسن کاری کے ساتھ ساتھ لہجے کی سادگی، سچائی اور تاثیر کا وہ حسن بھی جو Commitment کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ شعر دیکھئے۔

سمجھے تھے ہم تو میرؔ کو عاشق ایسی گھڑی
جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا

جذب و کیف، عشق اور جنون، ہجر اور تنہائی کے اداس دن رات اور اس طوفان میں گھرا آدمی، جس کے لہجہ میں تلخی، تندی شکوے شکایت کی بجائے، محبت کا ایک مضبوط آہنگ شکستگی کو بھی ایک ایسا وقار اور حوصلہ مندی عطا کرتا ہے جس کی عمارت وفا شعاری اور یقین کے گہرے اور پختہ رنگوں سے مزین رہے۔

جہاں کہیں میرؔ کی سچائی اور لہجہ کی صداقت کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے خارجی حسن اور فنکاری کے

جوہر دکھائے وہاں بھی معنوی حسن اپنی جگہ اسی طرح برقرار رہا ہے جو میرؔ کی داخلی کیفیات اور زندگی کی اصل حقیقت کا مظہر ہے۔

نمود کر کے وہیں بحر غم میں بیٹھ گیا
کہے تو میرؔ بھی اک بلبلا تھا پانی کا

اس شعر میں بحر، بلبلا اور پانی کی مناسبت کے ساتھ میرؔ کی وہ خصوصیات اپنی جگہ موجود ہیں جو ان کی فطری صداقت پر دلالت کرتی ہیں۔

آگ تھے ابتداء میں ہم
ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

ان کی شاعری میں زندگی کی اصل حقیقت اور اس کی فلاسفی کے نئے اسرار و رموز منکشف ہوتے ہیں غم عشق اور غم دوراں نے ان کی شاعری میں روایت پرستی کی بجائے زندگی کی اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے جو تلخیوں اور تکلیفوں کے باوجود سرور انگیز ہے۔

؎ تو ہے بے چارہ گدا ، میرؔ ترا کیا مذکور
مل گئے خاک میں یہاں صاحب و افسر کتنے

؎ یاں کے سپید و سیاہ میں ہم کو دخل ہے سو اتنا ہے
رات کو رو ، رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

؎ ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی
چاہے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

ان کی شاعری میں غم کا جذبہ حاوی ہونے کے باوجود کہیں زندگی سے گریز، فرار یا قنوطیت کی آواز شامل نہیں ہوتی۔ صبر و قرار کے ساتھ غم کا ایک ایسا گداز ہے جو پڑھنے والوں کی کثافتوں کو بھی دھونے کی

صلاحیت رکھتا ہے۔ اس آواز میں وفا کے دائمی رنگ اور حسن نے ایک ایسی موسیقی پیدا کی ہے جو آرزو کی خوشبو میں ڈوب کر جذب و کیف کے ایک نئے عالم سے متعارف کراتی ہے۔

؎ موسم ابر ہو ، سبو بھی ہو !
گل ہو ، گلشن ہو اور تو بھی ہو

؎ دل تمنا کدہ تو ہے پر میر
ہو تو اس کی ہی آرزو بھی ہو

میرؔ کے یہاں حوصلہ مندی، آبرومندی اور زندگی کے ساتھ سمجھوتے کا وہ انداز ہے جس میں بھونرا صفت رویے کا کوئی آہنگ موجود نہیں جس کے سبب شاعری کی نغمگی معدوم ہو کر معنویت کا حسن کھو جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں ہجر، آرزو اور غم نے ایک ایسے انسان سے متعارف کرایا ہے جس کی معصومیت، حصول اور محرومی کے درمیان کسی قسم کی کشمکش کا شکار نہیں ہوئی۔ ہر روپ اور ہر شکل میں عشق کا سوز اور کیف و سرور پوری شاعری میں سحر انگیز قوتیں پیدا کرتا ہے یہ قوتیں غم کے غمناک رویوں کو حیات افروز بنانے پر قادر ہیں جس نے ان کی شاعری میں ابدی خوشی اور غم کے سرور سے متعارف کرایا ہے۔

اگر اردو زبان و ادب کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو غزل کی تاریخ میں دکن خاص اہمیت کا حامل ہے، وجہیؔ، غواصیؔ، نصرتیؔ، ہاشمیؔ، سراجؔ اور سلطانؔ قلی قطب کی خدمات ناقابل فراموش ہیں لیکن اہمیت کے اعتبار سے غور کیا جائے تو ولی کو ان سب پر فوقیت حاصل ہے یہ نام اردو کے مرکز ثقل کو دہلی منتقل کرنے کا ایک بڑا ذریعہ بنا۔

محمد شاہؔ کا دور بھی غزل کی تاریخ میں اہم ارتقائی موڑ کہا جا سکتا ہے۔ شاہ مبارک آبروؔ اس عہد کے بڑے شعراء میں سے ایک ہیں۔ ساتھ ہی شاکر ناجیؔ بھی اس عہد کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ قدما کے اس عہد میں اردو شعر و شاعری کی محفل آرائی اور رونقیں مرزا مظہرؔ، خواجہ میر دردؔ، حاتمؔ، مرزا سوداؔ، میر سوزؔ کے دم سے قائم تھیں یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے اردو کو ذرے سے آفتاب بنانے میں اہم کردار ادا کیا

لیکن اس کے باوجود اندازِ بیان میں سچائی کی لطافت، فصاحت اور سوز کا جو انداز میرؔ نے اردو غزل کو دیا وہ کسی اور کے حصے میں شاید ہی آیا ہو یہاں تک کے ناسخؔ، غالبؔ، ذوقؔ، اکبرؔ، حسرتؔ تک نے ان کے اسلوب، لہجے کی بے ساختگی اور سچائی پر رشک کا اظہار کیا ہے۔

میرؔ کے کلام میں تاثیر کی قوت نے جذب و کیف کا وہ عالم پیدا کیا ہے جس سے دوری کے سبب آدمی ذاتی حصار میں قید ہو کر انسانیت سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ میرؔ کی سادگی، سچائی اور محبت میں ڈوبی لے کا وقار اور حسن قابلِ دید ہے۔

کہتا ہے دل کہ آنکھ نے مجھ کو کیا خراب
کہتی ہے آنکھ یہ کہ مجھے دل نے کھو دیا
لگتا نہیں پتہ کہ صحیح کون سی ہے بات
دونوں نے مل کر میر ہمیں تو ڈبو دیا

ان اشعار میں کتنی بلیغ بات کہی گئی ہے لیکن سادگی اور تاثیر کا کمال حیرتوں کے دروازے کھول دیتا ہے ان کی شاعری میں تجربے اور تخیل کی ہم آہنگی نے ماورائی تاثیر پیدا کر کے ایک ایسے سکون کی پہچان کرائی ہے جس کے پیچھے سینکڑوں اضطراب اور طوفان پوشیدہ ہیں جن کی شدت آدمی کو خس و خاشاک کی طرح اڑا لیجانے پر قادر ہے۔ لیکن ان کے سامنے بھی ایک حساس اور محبتوں میں سرشار، سینہ سپر نظر آنے والا شخص میر کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

؎ دریا دریا روتا ہوں میں
صحرا صحرا وحشت ہے

؎ جفا اس کی نہ پہنچتی انتہا کو
دریغا عمر نے کی بے وفائی

؎ قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل
سارے عالم کو میں دکھا لایا

؎ ہائے اس زخمی شمشیر محبت کا جگر
درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو

؎ آوارگان عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

؎ تلوار کے تلے ہی گیا عہد انبساط
مر مر کے ہم نے کاٹی ہیں اپنی جوانیاں

؎ عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

؎ اسی تقریب اس گلی میں رہے
منتیں ہیں شکستہ پائی کی

؎ ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

؎ مت تربتِ میرؔ کو مٹاؤ
رہنے دو غریب کا نشان تو

میرؔ کے کلام میں سہل ممتنع، چھوٹی یا طویل رواں اور مترنم بحریں اظہار کی ندرت، الفاظ کا چناؤ، روزمرہ کا استعمال، تشبیہات، استعارات، رمز و کنایہ، سادگی اور پرکاری، اجتماعی احساس، عہد کی آواز، تجربوں کی بھٹی سے نکلتی غم کی لو، پرستش اور سلگتے جذبے، خواہشوں اور آرزوؤں کی وادیٔ پرخار کے ساتھ ساتھ ضبط اور

پندار، عشق کا جلال، عشق کا جمال دیکھنے کے قابل ہے۔

؎ زنداں میں بھی، شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

؎ ہم رہ روانِ راہ فنا ہیں برنگ عمر
جاویں گے ایسے کھوج بھی پایا نہ جائے گا

؎ وہ صبح بزم خوش جہاں شب غم سے کم نہ تھی مہرباں
کہ چراغ تھا سو تو دود تھا، جو پتنگ تھا سو غبار تھا

؎ کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یک سر وہ استخوانِ شکستوں سے چور تھا

؎ فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

؎ مت سہل ہمیں سمجھو، پھرتے تھے بہم تب ہم!
برسوں تئیں گردوں نے جب خاک کو چھانا تھا

؎ آدمی سے ملک کو کیا نسبت
شان ارفع ہے میرؔ انساں کی

میرؔ کی شاعری کے پسِ پردہ موجود انسان وہ اصلی انسان ہے جس کی تخلیق کا مقصد ہی اس تہذیب نفس کی پرورش تھا جو کائنات میں نیابت کے فرائض کی انجام دہی کیلئے لازمی ہے۔ یہ کائنات جس کا قیام ایک مرکز کے گرد طواف کا مرہون منت ہے۔ غور کیا جائے تو طواف کو اپنائے بغیر دائمی بقا کا تصور محال ہے۔ غزل کا محبوب تو ایک علامت ہے۔ پرستش خالق کی ہو یا اس کی تخلیق کی۔ طواف کسی اجتماعی مقصد کے گرد ہو، کوئی

نصب العین، محور و مرکز ہو یا کوئی تخلیقی عمل ہو، دائمی زندگی کا دارومدار اسی طواف پر ہے لیکن اس حقیقت تک رسائی کیلئے مادی آلائشوں سے پاک ہونا ضروری ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت شاید ضروری ہے کہ مادی آلائشوں سے پاک ہونا زندگی تیاگنے کا نام نہیں ہے۔ میرؔ کے یہاں محبوب کا تصور کسی ماورائی مخلوق کا تصور نہیں دیتا وہ ایک خالص آدمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرؔ کا عشق پارسائی کے نام پر ماورائی سرحدوں کا التزام نہیں رکھتا بلکہ لمسیاتی کیفیتوں کا اظہار بھی رکھتا ہے لیکن اس میں بھی سچائی کے حسن نے حرص و ہوس کی بجائے فطری حسن سے ہی متعارف کرایا ہے۔

؎ گوندھ کے گویا پتی گل کی وہ ترکیب بنائی ہے
رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں

؎ اب کے بہت ہے شورِ بہاراں، ہم کو مت زنجیر کرو
دل کی ہوس تک ہم بھی نکالیں، دھومیں ہم کو مچانے دو

؎ پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی تو پوچھتے تم اتنے پیارے کیوں ہوئے

؎ کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشم گریہ ناک
مژگان تو کھول، شہر کو سیلاب لے گیا

؎ عاشق ہم کو جان لیا ہے شاید ان نے میرؔ ہمیں
دیکھ بھری مجلس میں اپنی ہم ہی سے شرماتا ہے

؎ کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

ے چلا نہ اٹھ کے وہیں چپکے پھر تو میرؔ
ابھی تو اس کی گلی سے پکار لایا ہوں

ے ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

ے لعلِ خموش اپنے دیکھو ہو آرسی میں
پھر پوچھتے ہو مجھ سے مجھ بے نوا کی خواہش

میرؔ کے عشقیہ رویے میں شدت، توانائی اور سچائی کے ساتھ فطری جذبوں کا حسن شامل ہے۔ مگر تہذیبِ نفس اسے حیوانی شدتوں میں تبدیل نہیں ہونے دیتی۔

ان کے ہر شعر میں کسی نہ کسی صورت طواف کا منظر ہے۔ وہ طواف جو انسان کی دائمی بقا کیلئے لازمی ہے۔ اس طواف کا حسن، سادگی اور نغمگی میر کی شاعری میں اس آواز کو محسوس کرواتی ہے۔ جو مشینوں کے شور میں کہیں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ اس آواز کے گم ہونے کا احساس میرؔ کو خود بھی تھا۔

ے باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنئے گا
پڑھتے کسی کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا

ے پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں !

یہ میرؔ کا عہد تھا جس میں غم کی تیز آندھیوں میں بھی انسانی مثبت صفات شعر و ادب کے روپ میں زندہ اور تابندہ دکھائی دیتی ہیں۔ میرؔ کی محبت نے دکھوں کی گود میں پرورش پائی تھی۔ وہ انسان کی محبت میں سرشار شاعری کرتے رہے۔ ان کی سرشاری اور شاعری تھکے ہوئے مغموم ذہنوں کیلئے ایسی آسودگی کا جام لنڈھاتی رہی جس میں سچائی اور تاثیر کی شراب مہکا کرتی۔ شاید اسی لئے میرؔ نے کہا تھا کہ ''مدتوں یاد رہیں گی یہ

باتیں ہماریاں'' مدتوں سے ان کی مراد کیا تھی؟ ''مدت'' کا تعین کون کرے گا۔ آج گلیوں اور کوچوں میں لوگ میرؔ کے ریختے پڑھتے نہیں پھرتے بلکہ ترقی یافتہ اقوام کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے مرعوب ہو کر تحقیق اور تخلیق کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے ان کی زبان میں ''گٹ پٹ''، ''گٹ پٹ'' کرتے پھرتے ہیں جس کی لایعنیت بھیڑوں کی چلاتی ممناہٹ کے مماثل ہے۔ شاید ان کے نزدیک یہ آواز، یہ گفتگو ہی ترقی اور بڑا ہونے کا نشان ہے۔ ترقی یافتہ اقوام نے اس چاند پر قدم رکھ دیا ہے جو محبوب کے چہرے کو منعکس کیا کرتا تھا۔ اور میر تقی میر کے قبیلے نے چاند اور خواب دونوں کو چھوڑ کر مغرب سے درآمد شدہ خیرہ کن روشنیوں میں جینا شروع کر دیا ہے جس سے بینائی اور بصیرت دونوں رخصت ہوئی جاتی ہیں۔ آنکھیں ویران ہیں جن سے خواب تو کیا حیرت بھی نہیں جھانکتی۔

نظر میرؔ نے کیسی حسرت سے کی
بہت روئے ہم اس کی رخصت کے بعد

انتخابی مطالعہ:

نمبر شمار	کتاب	مصنف	پبلیشر
۱۔	اردو غزل	ڈاکٹر یوسف حسین خان	مکتبہء جامعہ ترقی ادب لاہور
۲۔	انتخابِ میرؔ	ڈاکٹر عبدالحق	---------------
۳۔	کلیاتِ میرؔ	کلب علی خان فائق	مجلس ترقی ادب لاہور طبع اوّل 1981
۴۔	بابر	ہیر اللہ مترجمہ سید ہاشمی فرید آبادی	فکشن ہاؤس 18۔ مزنگ روڈ لاہور 1998
۵۔	تذکرہ شعرا اردو	میرؔ حسن دہلوی	انجمن ترقی اردو ہند 1940
۶۔	(تذکرہ) مخزن نکات	شیخ قائم چاندپوری	مطبوعہ انجمن ترقی اردو 1929
۷۔	بحث و نظر	ڈاکٹر سید عبداللہ	مکتبہ اردو۔ لاہور
۸۔	آبِ حیات	محمد حسین آزاد	شیخ مبارک علی۔ لاہور

۹۔	تاریخ اردو ادب	رام بابو سکسینہ	----------
۱۰۔	عہد مغلیہ (معہ دستاویزات)	صفدر حیات صفدر	نیو بک پیلس اردو بازار لاہور
۱۱۔	کلیات میرؔ	(مرتبہ) آسی لکھنوی	نول کشور 1941
۱۲۔	تاریخ ہند	مولوی ذکاء اللہ دہلوی	علی گڑھ 1917
۱۳۔	کلاسیکی ادب	خواجہ احمد فاروقی	آزاد کتاب گھر دہلی
۱۴۔	شعر العجم	مولانا شبلی نعمانی	دار المصنفین اعظم گڑھ (جلد چہارم)
۱۵۔	مومن	کلب علی خان فائق رامپوری	مجلس ترقی ادب 2-نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور
۱۶۔	میر تقی میرؔ اور آج کا ذوق شعری	محبّ عارفی	نفیس اکیڈمی اردو بازار لاہور

رسائل:

۱۔	نقوش لاہور	ش 33-34
۲۔	نیرنگ خیال	میرؔ نمبر رام پور 1928
۳۔	نگار	(۱) لکھنو ستمبر 1945ء
		(2) اردو شاعری نمبر مارچ 1951ء
۴۔	خیابان	(شرر نمبر) شمارہ 7 آئینہ ادب لاہور 1992ء

☆☆☆